POSTED AT LPC Delhi RMS
ON 10-11 May 2026, R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) - 01/1195/2024-26, Licensed to Post
Without Prepayment U (C) - 160/2024-26, ISSN 2456-8511

Total Pages
8

HAMARI
ZABAN
(Weekly)

ہفت روزہ
ہماری زبان
اشاعت کا 87 واں سال

Date of Publication: 09-05-2026 • Price: 5/- • 15-21 May 2026 • Issue: 19 • Vol:85

۱۵تا۲۱رمئی ۲۰۲۶ء • شمارہ:۱۹ • جلد:۸۵

اُردو کے قلیل الاستعمال الفاظ و مرکبات

(اردو لُغت بورڈ کی لُغت کے تناظر میں)

رؤف پاریکھ

کبھی کبھی اردو کا کوئی ایسا لفظ یا محاورہ یا مرکب پڑھنے یا سننے میں آتا ہے جو لغات میں نہیں ملتا۔ لغات میں کسی لفظ یا مرکب کے نہ ملنے کا ایک سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ کوئی بھی لغت صحیح معنوں میں مکمل نہیں کہی جاسکتی کیوں کہ انسانی کوششوں کی بہرحال ایک حد ہوتی ہے اور جامع ترین اور ضخیم ترین لغات میں بھی کئی اندراجات بوجوہ رہ جاتے ہیں۔ انگریزی کی ضخیم ترین اور مستند ترین لغت یعنی The Oxford English Dictionary جس کے پہلے ایڈیشن (۱۹۲۸ء) کی بارہ (۱۲) اور دوسرے ایڈیشن (۱۹۶۲ء) کی بیس (۲۰) جلدیں ہیں، جس میں انگریزی کا ہر لفظ درج کرنے کا ارادہ ظاہر کیا گیا تھا اور جو ستر (۷۰) سال کے طویل عرصے اور محنتِ شاقہ کے بعد مرتب ہوئی اس میں بھی بڑی تعداد میں لفظ شامل ہونے سے رہ گئے تھے۔ پھر اس کے ضمیمے ۱۹۷۲ء سے ۱۹۸۶ء کے درمیان چھپتے رہے جن میں تقریباً پچاس ہزار اندراجات کا اضافہ کیا گیا تھا[1]۔

دراصل اوکسفرڈ کی لغت اور پھر اردو لغت بورڈ (کراچی) کی لغت 'اردو لغت (تاریخی اصول پر)' بھی تاریخی (historical) یا تاریخی لسانیاتی (philological) اصول پر مرتب کی گئی ہے۔ اس اصول کی تفصیل دینا یہاں ممکن نہیں اور راقم نے اپنے ایک مقالے میں اس کی وضاحت کی تھی جو راقم کی کتاب 'علمِ لغت، اصولِ لغت اور لغات' میں شامل ہے[2]۔ مختصراً یہ کہ زبان کے ارتقا کے کچھ تاریخی مراحل ہوتے ہیں جن میں سے ہر ایک مرحلہ اپنی خصوصیات کے لحاظ سے کچھ مدت مثلاً ایک ڈیڑھ یا دو صدی پر محیط ہوسکتا ہے۔ لغت میں جو لفظ لکھا جائے اس کی سند ہونی چاہیے اور سند یہ ہے کہ اگر کوئی لفظ ان تمام تاریخی ادوار میں مستعمل رہا ہے (یعنی اس کے استعمال کی اسناد ہر دور کے اہلِ قلم کے ہاں ملتی ہیں) تو گویا اس کا مفہوم اور مفہوم کی شقیں درست ہیں اور وہ لغت میں درج کیے جانے کے قابل ہے۔ اگر کسی لفظ کی سند بعد کے دور میں نہیں ملتی تو گویا وہ لفظ اس دور میں متروک ہوگیا تھا یا کم از کم اس مفہوم میں متروک ہوگیا تھا۔ کیونکہ کسی لفظ کے کوئی معنی نہیں ہیں جب تک وہ کسی متن (شعر یا نثر) میں استعمال نہ ہو۔ لفظ کے معنی اس کے استعمال سے اور اس استعمال میں تسلسل سے طے ہوتے ہیں اور اس کی سند ہر دور کے مستند اہلِ قلم سے ملنی چاہیے۔ تاریخی اصول سے یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ کسی لفظ کا اولین یعنی قدیم ترین استعمال تحریری صورت میں کب ہوا اور یہ لفظ اس کے بعد کے کن ادوار میں کس کس مفہوم میں آیا ہے۔ یہی تاریخی یا لسانی یا فلولوجیکل اصول ہے۔ اسی بنیاد پر اوکسفرڈ کی کلاں لغت اور کراچی کی کلاں لغت (جو بائیس (۲۲) جلدوں پر مشتمل ہے) مرتب کی گئی ہیں۔

گویا اگر تاریخی اصولوں پر مرتب کی گئی لغت میں کسی لفظ کا اندراج نہ ہو تو شبہ ہوتا ہے کہ اس کے استعمال کی سند نہیں ملی ہوگی۔ یا اگر کوئی اندراج بغیر کسی سند کے ہے تو شبہ ہوتا ہے کہ معنی کیسے طے کیے گئے اور درست ہوں گے بھی یا نہیں کیوں کہ معنی سند ہی سے برآمد ہوتے ہیں۔ اسی لیے تاریخی اصولوں پر مبنی لغت میں اسناد کا درج کیا جانا بہت ضروری ہے۔

فرہنگِ آصفیہ اور نور اللغات میں بھی کئی الفاظ و مرکبات درج ہونے سے رہ گئے۔ مہذب اللغات میں بھی، جو چودہ (۱۴) جلدوں پر محیط ہے، کئی الفاظ شامل نہ ہوسکے۔ انگریزی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا کی سب سے وسیع ذخیرۂ الفاظ رکھنے والی زبان ہے اور اس میں تقریباً پانچ لاکھ الفاظ شامل ہیں۔ اردو لغت بورڈ (کراچی) کی بائیس (۲۲) جِلدی لغت اردو کی ضخیم ترین لغت ہے اور باون (۵۲) برس کی محنت اور کوشش کے بعد مرتب ہوسکی۔ اس میں راقم کے اندازے کے مطابق تقریباً دو لاکھ پچیس ہزار الفاظ و مرکبات کا اندراج ہے، لیکن اس میں بھی ہزاروں نہیں تو سیکڑوں الفاظ و مرکبات درج نہیں ہوسکے ہیں۔ سیکڑوں الفاظ و مرکبات ایسے بھی ہیں جن کا بورڈ کی لغت میں اندراج تو ہوگیا ہے مگر یا تو ان کی اسناد نہیں ہیں (حالاں کہ بورڈ نے طے کیا تھا کہ ہر لفظ کے ہر معنی کی کم از کم دو اسناد ہر دَور سے دی جائیں گی) یا اسناد کی کمی ہے یا معنی کی کوئی شق یا شقیں درج ہونے سے رہ گئی ہیں، اس پر کوئی نکیر نہیں کی جاسکتی کیوں کہ تنقید کرنا بہت آسان ہے، خود لغت مرتب کرنا جان لیوا کام ہے۔

اس قسم کے قلیل الاستعمال یا نادر الفاظ یا ان کی اسناد جب کہیں نظر آتی ہیں تو راقم ایک طالبِ علم کی حیثیت سے ان کا اندراج اپنے پاس یادداشت کے طور پر کرلیتا ہے اور ان کے معنی کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ زبان اور لغت کی حفاظت بہت ضروری ہے۔ قلیل الاستعمال، نادر الظہور، غریب اللغت، غریب الاستعمال اور قلیل الورود الفاظ و تراکیب کو سمجھنا، ان کے محلِ استعمال کو جاننا اور انھیں محفوظ کرنا زبان و لغت کی حفاظت کا ایک طریقہ ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے 'تضمین اللغات' کے عنوان سے نادر الفاظ کو مع اسناد اپنے رسالے 'شب خون' میں پیش کرنے کا اہم کام شروع کیا تھا۔ انھوں نے اردو لغات میں بڑی تعداد میں الفاظ درج نہ ہونے یا انھیں ٹکسال باہر کیے جانے پر بجا طور پر اعتراض اٹھایا تھا اور بقول ان کے لغات میں الفاظ کا ''اندراج نہ کرنا زبان کی تاریخ، اور تاریخ ہی نہیں اس کے زندہ ادب کو بھی مردہ گوشت کی طرح کاٹ کر پھینک دینا ہے''[3]۔ ڈاکٹر عبدالرشید صاحب نے بھی اس سلسلے میں چند اہم مضامین سپردِ قلم کیے تھے جن میں ایسے نادر الفاظ و محاورات اسناد کے ساتھ درج تھے جن کا اندراج اردو لغت بورڈ کی لغت میں

اپیل

تمام اہلِ اردو سے گزارش ہے کہ 2027 کی مردم شماری میں زبان کے کالم میں اپنی مادری زبان کے طور پر اردو کا اندراج ضرور کریں۔ یہ نہ صرف ہماری شناخت کا مسئلہ ہے بلکہ اُردو کے حقوق، ترقی اور سرکاری سطح پر اس کے فروغ کے لیے بھی نہایت ضروری ہے۔

آئیں، اپنی زبان کی بقا اور وقار کے لیے بیدار ہوں اور اپنی ذمے داری کا ثبوت دیں۔

قارئین! اب 'ہماری زبان' کا مطالعہ انجمن ترقیِ اردو (ہند) کی ویب سائٹ www.atuh.org پر بھی کرسکتے ہیں جہاں اِسے مفت میں ڈاؤن لوڈ کرنے کی سہولت بھی موجود ہے۔

نہیں ہے،[۴][۵]۔

فاروقی صاحب نے تضمین اللغات میں فیروز اللغات، فرہنگِ آصفیہ اور پلیٹس کو بنیاد بنا کر یہ طے کیا تھا کہ اگر کوئی لفظ ان میں سے دو لغات میں نہیں ہے تو وہ ''نادر'' ہے (اگرچہ ہماری نظر میں فیروز اللغات کوئی معیاری یا مستند لغت نہیں ہے اور اس کا اس فہرست میں شمول بحث طلب ہے)۔ لیکن نادر الفاظ و مرکبات کی مع اسناد جمع آوری کا ہمارا زیرِ نظر کام بنیادی طور پر اردو لغت بورڈ کی لغت کے تناظر میں ہے کیوں کہ اردو کی ضخیم ترین اور مستند ترین لغت میں کسی لفظ، یا اس کے معنی کی کوئی شق یا معنی کی سند درج نہ ہونے کا مطلب یہی ہے کہ یہ قلیل الاستعمال اور نادر لفظ ہے اور اس کو محفوظ کیا جانا ضروری ہے۔ تاہم یہاں دیگر معروف و متداول لغات کے اندراجات اور ان میں کسی لفظ کے شمول یا عدم شمول کو بھی نظر میں رکھا گیا ہے اور معنی و قواعدی حیثیت (اسم، فعل، صفت) نیز تلفظ وغیرہ کے تعین کے لیے بھی متداول لغات سے مدد لی گئی ہے۔

رفعِ شر کے خیال سے عرض ہے کہ اس کام کا مقصد کسی لغت یا لغت نویس (بالخصوص اردو لغت بورڈ اور اس کے مرتبین) پر نکتہ چینی یا ''حرف گیری'' نہیں ہے (یہ ہیچ مداں طالبِ علم بھی بورڈ میں کچھ عرصے خدمات انجام دے چکا ہے)، بلکہ یہاں نیت یہ ہے کہ اگر کسی کمی یا خامی کا احساس ہو تو اسے دور کرنے کی کوشش کی جائے تا کہ ہماری خوب صورت زبان کی ثروت اور زندگی میں اضافہ ہو اور ان الفاظ کو محفوظ کرنا بھی پیشِ نظر ہے جن کے بارے میں خطرہ ہے کہ، بقول فاروقی صاحب کے، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہماری زبان سے محو ہو جائیں گے[۶]۔

لغت نویس کا کام اس لحاظ سے بہت عجیب ہے کہ ذرا سی بھی کوتاہی ہو جائے تو اس کی باقی تمام محنت سے صرفِ نظر کر کے اس ایک غلطی کو اچھالا جاتا ہے اور وہ بے چارہ دیدہ ریزی کے باوجود نکو بنتا ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ لغت نویس کی بڑی کامیابی یہی ہے کہ لومت لائم سے بچ جائے کیوں کہ اس کی محنت کا نہ کوئی صلہ دے سکتا ہے اور نہ صحیح معنوں میں داد۔ ویسے بھی لغت کا کام کبھی ختم نہیں ہوتا اور ہر لغت کے نئے ایڈیشن میں کچھ نہ کچھ تبدیلی کرنی پڑتی ہے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ دس سال کے بعد تو لغت کسی حد تک از کار رفتہ ہو جاتی ہے، لفظ معنی بدل لیتے ہیں، نئے الفاظ، محاورات اور اصطلاحات آ جاتی ہیں۔ یہاں ایسے ہی کچھ الفاظ پیشِ خدمت ہیں جو نسبتاً قلیل الاستعمال اور نادر الظہور ہیں اور اردو لغت بورڈ کی لغت میں ان کا اندراج نہیں ہے یا اگر اندراج ہے بھی تو کوئی کمی رہ گئی ہے، مثلاً معنی کی کوئی شق درج ہونے سے رہ گئی ہے یا سند درج نہیں ہے۔

سند کی اہمیت اہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ کسی لفظ کے کوئی معنی نہیں جب تک وہ کسی جملے یا شعر میں نہ آئے۔ لہٰذا یہاں بھی الفاظ و تراکیب کے ساتھ اسناد پیشِ خدمت ہیں۔

اُجلا خَرچ

(الف مضموم، ج ساکن، خ مفتوح، ر ساکن) (مرکبِ توصیفی)

(مجازاً) خرچ جو معزز اشخاص یا شرفا کے رکھ رکھاو کے مطابق ہو۔

اردو لغت بورڈ کی لغت میں 'اجلا خرچ' کا اندراج نہیں ہے۔ اس کا اندراج فرہنگِ آصفیہ، امیر اللغات، نور اللغات اور مہذب اللغات میں بھی نہیں ہے۔ اگرچہ لفظ 'اُجلا' کا اندراج بورڈ کی لغت میں ہے (جلد اول، ص ۱۹۹) لیکن اس کا ذیلی مرکب 'اجلا خرچ' بھی درج ہونا چاہیے تھا۔ بورڈ نے لفظ اُجلا کے کئی معنی دیے ہیں اور ان میں سے ایک معنی ہیں: امیرانہ، شریفانہ، پُرتکلف، باسلیقہ۔ معنی درست ہیں اور اجلا خرچ اِنھیں معنوں میں ہے۔ یہ مرکب مستعمل رہا ہے اور دورِ حاضر میں بھی مستعمل ہے۔ اس کی سند پیش ہے:

☆ ہمیشہ غیر ملکی قیمتی سگریٹ پیتے۔ موٹر بھی تھی، بڑا اجلا خرچ تھا۔ (مجموعہ ڈاکٹر اسلم فرخی، ص ۴۷۵)

احتجاجی

(الف مکسور، ح ساکن، ت مکسور) (صفت)

معنی ہیں: احتجاج کا، احتجاج سے منسوب و متعلق، جس میں احتجاج ہو۔

فرہنگِ آصفیہ، امیر اللغات اور نور اللغات میں احتجاج، احتجاجاً اور احتجاجی درج نہیں ہیں۔ غالباً اس دور میں رائج نہیں تھے۔ مہذب اللغات میں احتجاج تو درج ہے لیکن احتجاجاً اور احتجاجی درج نہیں ہیں۔ بورڈ نے 'احتجاج' اور 'احتجاجاً' تو درج کیے ہیں (جلد اول، ص ۲۴۱) لیکن 'احتجاجی' کا اندراج بورڈ کی لغت میں بھی نہیں ہے۔ دوسرے ایڈیشن میں درج کیا جا سکتا ہے۔ سند موجود ہے:

☆ آج سے ڈھائی پونے تین سو برس پہلے کے دور کی یہ احتجاجی اور مزاحمتی آواز اردو ادب میں پہلی اور منفرد آواز تھی۔ (عتیق احمد، اردو ادب میں احتجاج، ص ۴۸)

اِحیاءُ العُلُوم/ اِحیاے عُلُوم

(الف مکسور، ح ساکن) (مرکبِ اضافی)

لفظاً: علوم کی حیاتِ نو، علوم و فنون کے نئی زندگی پانے یا دوبارہ ترقی کرنے کا عمل؛ مراداً: تاریخ میں قرونِ وسطیٰ کے بعد پندرھویں اور سولھویں صدی کے لگ بھگ کا وہ دور جب یورپ میں علوم و فنون نے ازسرِ نو ترقی کرنا شروع کی، نشأۃِ ثانیہ (انگریزی: Renaissance)۔

آصفیہ نے 'احیا' درج نہیں کیا لہٰذا اس کا ذیلی مرکب احیاے علوم بھی درج نہیں ہے، لیکن تعجب ہے کہ اس میں احیاناً درج ہے۔ یہی کیفیت امیر اللغات کی بھی ہے۔ نور نے احیاء (ہمزہ کے ساتھ) دیا ہے لیکن کوئی تحتی مرکب نہیں درج کیا۔ بورڈ نے احیاے علوم درج نہیں کیا۔ حالاں کہ احیاء کا اندراج بورڈ نے کیا ہے۔ احیاء العلوم یا احیاے علوم کا اندراج بطور ذیلی یا تحتی مرکب ہونا چاہیے۔ 'ت' کی تقطیع میں لفظ 'تحریک' کے ذیل میں تحریکِ احیاے علوم کی ترکیب کا بھی اندراج ہو سکتا تھا لیکن بورڈ نے وہاں بھی درج نہیں کیا۔ اس طرح کی علمی اصطلاحات کا جو عام طور پر استعمال ہوتی ہیں لغت میں اندراج ضروری ہوتا ہے۔

سند پیش ہے:

☆ اٹلی میں یہ دور متضاد حالات کا مرقع ہے۔ اسی میں تحریکِ احیائے علوم کمال پر پہنچی۔ (غلام رسول مہر (مترجم)، انسائیکلو پیڈیا تاریخِ عالم، جلد ۲، ص ۲۸۱)

اَز دِیدہ دُور اَز دِل دُور (کہاوت)

لفظاً: آنکھ سے دور، دل سے دور۔ مراد یہ کہ جو نظر کے سامنے نہ ہو اس کا خیال بھی دل میں نہیں رہتا۔

فرہنگِ آصفیہ، امیر اللغات، نور اللغات اور مہذب اللغات نے اس کہاوت کا اندراج نہیں کیا۔ بورڈ نے بھی نہیں کیا۔ مسعود حسن رضوی ادیب کی 'فرہنگِ اَمثال' میں بھی یہ درج نہیں ہے حالانکہ اس میں اردو میں مستعمل عربی و فارسی کہاوتیں بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ البتہ وارث سرہندی نے جامع الامثال میں یہ کہاوت درج کی ہے۔ اور معنی دیے ہیں: سامنے نہ رہنے والا فراموش ہو جاتا ہے۔

اس ضرب المثل کی اسناد حاضر ہیں:

☆ ان دونوں کے بارے میں لکھیے۔۔۔از دیدہ دور از دل دور کی کہاوت پر عمل نہ کیجیے۔ (یوسف بخاری، یارانِ رفتہ (سید ہاشمی فرید آبادی کا خط، مرقومہ ۱۹۶۰ء)، ص ۱۳۵)

☆ خط نہ لکھنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ از دیدہ دور از دل دور۔ (مشفق خواجہ، مکتوباتِ مشفق خواجہ بنام نظیر صدیقی، ص ۱۷)

اِستعلا

(الف مکسور، س ساکن، ت مکسور، ع ساکن) (اسم، مذکر)

۱۔ (لفظاً) اوپر چڑھنے کا عمل یا کیفیت، یہ عربی لفظ اردو میں غلبہ یا برتری کے مفہوم میں آتا ہے (اشتقاق: ع ل و)۔

۲۔ (تجوید) زبان کی جڑ کا تالو کی طرف بلند ہونے کا عمل۔

استعلا کا لفظ آصفیہ، امیر، نور اور مہذب نے نہیں دیا۔ بورڈ کی لغت میں درج کیا گیا ہے اور اسناد بھی موجود ہیں، لیکن تجوید کی اصطلاح کے طور پر صرف ایک سند دی گئی ہے جو ۱۹۰۵ء میں شائع شدہ کتاب 'معین القرا' کی ہے۔ کم از کم ایک سند کا اضافہ ہونا چاہیے، جو پیش ہے:

☆ طا [ط] صفتِ استعلاء اور اطباق کی وجہ سے پُر پڑھا جاتا ہے۔ (قاری غلام رسول، علم التجوید، ص ۲۵)

حواشی:

۱ سائمن ونچسٹر (Simon Winchester)، The Meaning of Everything: The Story of the Oxford Englsih Dictionary (نیویارک: اوکسفرڈ، ۲۰۰۳ء)، ص ۱۴۰-۱۳۹

۲ (کراچی: فضلی سنز، ۲۰۱۷ء)۔

۳ تضمین اللغات: نادر لغاتِ اردو کی فرہنگ مع اسناد (قسط اول)، شب خون، الہ آباد، جولائی، ۱۹۹۸ء، ص ۳۰۔

۴ مثلاً: ڈاکٹر عبدالرشید، اردو لغت (تاریخی اصول پر): چند معروضات، مشمولہ اردو ادب، دہلی، جولائی۔ستمبر ۲۰۰۷ء۔ نیز یہ مضمون راقم کی مرتبہ کتاب اردو لغت نویسی: تاریخ، مسائل اور مباحث (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۰ء) میں بھی شامل ہے۔

۵ اس سلسلے کا ڈاکٹر عبدالرشید صاحب کا ایک اور مضمون 'کچھ اور محاورات: جو اردو لغت (تاریخی اصول پر) (کراچی) میں درج نہیں ہیں' کے عنوان سے راقم کی ادارت میں شائع ہونے والے رسالے 'غالب' (کراچی) کے شمارہ ۲۱ (۲۰۱۳ء) میں شائع ہوا تھا۔

۵ تضمین اللغات، مشمولہ شب خون، محولہ بالا، ص ۲۹۔

مآخِذِ اَسناد:

۱۔ اسلم فرخی، مجموعہ ڈاکٹر اسلم فرخی، لاہور: سنگِ میل، ۲۰۱۶ء۔

۲۔ عتیق احمد، اردو ادب میں احتجاج، لاہور: مکتبۂ عالیہ، ۱۹۸۷ء۔

۳۔ قاری غلام رسول، علم التجوید، لاہور: مکتبۂ فروغِ تجوید و قرأت، ۱۹۶۷ء۔

۴۔ غلام رسول مہر (مترجم)، انسائیکلو پیڈیا تاریخِ عالم، جلد ۲، لاہور: شیخ شوکت علی، ۱۹۸۵ء (اشاعتِ دوم)۔

۵۔ یوسف بخاری، یارانِ رفتہ، کراچی: مکتبۂ اسلوب، ۱۹۸۷ء۔

۶۔ مشفق خواجہ، مکتوباتِ مشفق خواجہ بنام نظیر صدیقی، ادارۂ مطبوعاتِ سلیمانی، ۲۰۱۰ء۔

ریٹائرڈ پروفیسر، شعبۂ اردو، جامعہ کراچی، یونیورسٹی روڈ، کراچی-75270 (پاکستان)

E-mail: drraufparekh@yahoo.com

Mob. No.: 0322 384 2648

ادبِ اطفال: ضرورت و اہمیت

عارف عزیز

ادبِ اطفال سے مراد وہ تخلیقات ہیں جو بچوں کے ذہنی و فکری شعور کو پیشِ نظر رکھ کر آسان و سلیس زبان میں لکھی جاتی ہیں، یہ ادب نہ صرف بچوں کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرتا ہے بلکہ اُنھیں زندگی کے نشیب و فراز کو سمجھنے اور عمل کرنے کا شعور بھی عطا کرتا ہے۔ یہیں سے ادبِ اطفال کی ضرورت و اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اُردو زبان میں بچوں کے ادب کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں، 1857 کی جنگِ آزادی کے بعد پہلی مرتبہ بچوں کے ادب پر توجہ دی گئی، اِس سے پہلے کی ایک صدی کے دوران اُردو زبان میں بچوں کے ادب کا تفصیلی سراغ نہیں ملتا، اگر چہ ضمناً کہیں کہیں تذکرے ضرور ہوتے ہیں، لیکن ان کی حیثیت باقاعدہ ادبِ اطفال جیسی نہیں سمجھی گئی۔ بچوں کے ادب سے بے اعتنائی کا حال یہ رہا ہے کہ عوام تو کیا، لکھنے پڑھنے والوں کو بھی معلوم نہیں کہ 'بچوں کی کتابوں کا عالمی دن' پچاس سال سے دنیا میں منایا جارہا ہے۔ اگر شاعروں اور ادیبوں سے دریافت کیا جائے کہ اُنھوں نے بچوں کے ادب کے لیے کچھ لکھا ہے تو بڑی تعداد کا جواب نفی میں ہوگا۔

یہ صحیح ہے کہ بچوں کے لیے لکھنا، بڑوں کے لیے لکھنے سے زیادہ پیچیدہ عمل ہے، لیکن اُردو کے مشاہیر اہلِ قلم نے اِس کی اہمیت کو سمجھا تھا، تبھی مرزا غالب، مولانا محمد حسین آزاد اور ڈپٹی نذیر احمد نے بچوں اور نوجوانوں کے لیے قلم اُٹھایا۔ مولانا الطاف حسین حالی، نظیر اکبرآبادی نے بھی بچوں کے لیے نظمیں لکھیں، جن میں پند و نصائح کے طور پر بہادری و بلند کرداری اور اتفاق و اتحاد کی ترغیب دی گئی تھی، جہاں تک بچوں کے لیے مستقل لکھنے کا سوال ہے تو مولوی اسماعیل میرٹھی پہلا نام ہے، جنھوں نے بچوں کے لیے خوب لکھا اور اُن کی نظمیں بچوں میں مقبول ہوئیں، مولوی ذکاء اللہ نے زبان و ادب کی خدمت کے ساتھ خود کو طلبہ کی نصابی کتب مرتب کرنے کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ مولانا حالی، علامہ شبلی نعمانی اور علامہ اقبال کا شمار قوم کے مصلحوں میں ہوتا ہے، اُنھوں نے اپنی تحریروں سے انسانیت کی فلاح و بہبود کا اہم کام لیا لہٰذا فطری طور پر اُن کی توجہ بچوں کی اخلاقیات بہتر کرنے کے لیے کارآمد ادب تخلیق کرنے کی طرف مبذول ہوئی۔

اکیسویں صدی کے آغاز تک اُردو زبان میں بچوں کا ادب تین صدیوں پر محیط ہوگیا ہے، کیوں کہ انیسویں صدی کے آخر میں اِس کی ابتدا ہوئی، بیسویں صدی میں اِس کا فروغ ہوا اور آج اکیسویں صدی میں اِس کا تسلسل جاری ہے، تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مغرب کے معیار کا 'ادبِ اطفال' ہمارے یہاں تخلیق نہیں ہوسکا۔ پچھلی صدی میں تعلیم کا فروغ ہونے سے یہ ضرور ہوا کہ تعلیم گھروں اور مدرسوں سے سرکاری اسکولوں میں منتقل ہوگئی، اخبار و رسائل پڑھنے پر عوام کے ساتھ نئی نسل کا رُجحان بڑھا تو بچوں کے لیے بڑے ادیبوں نے بھی لکھنا شروع کردیا۔ امتیاز علی تاج کے چچا چھکن کا کردار اور ڈرامے، حفیظ جالندھری کی عمرو عیار، خواجہ حسن نظامی کے انشائیے، پریم چند کی کہانیاں، کرشن چندر کے ناول اِس سلسلے کی اہم کڑیاں ہیں۔ بیسویں صدی میں بچوں کے لیے جن اہلِ قلم نے اس طرف توجہ کی، اُن کی فہرست طویل ہے، ڈاکٹر ذاکر حسین، محوی صدیقی، حامد اللہ افسر، صالحہ عابد حسین، احمد ندیم قاسمی، عادل رشید، سراج انور، امین حزیں، فراغ روہوی، وکیل نجیب چند نام ہیں، جنھوں نے بچوں کے لیے نثر کی محفل آراستہ کی۔ بچوں کے رسائل کے لیے قلم اُٹھانے والے شعرا میں حفیظ جالندھری، تلوک چند محروم، راجہ مہدی علی خاں، شفیع الدین نیر، ظفر گورکھپوری، مظفر حنفی، ڈاکٹر محبوب راہی، حافظ شکارپوری، متین نیاز، انجم مظفرپوری شامل ہیں، جب کہ خواتین قلم کاروں میں لیلیٰ خواجہ بانو، حجاب امتیاز علی، صالحہ عابد حسین، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، اے آر خاتون، عفت موہانی، شفیقہ فرحت، عطیہ حزیں، صادقہ نواب سحر، کشور ناہید، بانو سرتاج، رضیہ سجاد ظہیر، مسعودہ حیات، رفیعہ منظور الامین اور جیلانی بانو کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ جہاں تک بچوں کے رسائل کے اجرا کا سوال ہے تو آزادی سے قبل چند رسائل بچوں کے لیے نکالے گئے۔ 'اتالیق' ۱۹۰۸ء میں حیدرآباد سے منظرِ عام پر آنے والا پہلا رسالہ ہے، بعد میں 'ادیبِ اطفال'، 'المعلّم'، 'نونہال' جاری ہوئے، وہاں کے کئی اُردو روزناموں نے بچوں کے لیے صفحات مخصوص کرکے اور اُن کی انجمنیں بناکر بڑی مقبولیت حاصل کی۔ ملک کے دوسرے اُردو اخبارات نے بھی اِس روایت کو آگے بڑھایا۔ آزادی کے بعد بچوں کے جن رسائل نے پورے ملک میں دھوم مچادی اُن میں دہلی کے 'کھلونا' اور 'پیامِ تعلیم' سرِ فہرست ہیں، ان کے علاوہ 'رنبیر'، 'نور'، 'غنچہ'، 'ہلال'، 'اچھا ساتھی' وغیرہ بچوں کے درجنوں رسائل مختلف شہروں سے شائع ہوکر نئی نسل کی تربیت کا کام انجام دیتے رہے ہیں۔

حالاں کہ بچوں کے ادب کی تخلیق آسان کام نہیں، اِسے بخوبی انجام دینے کے لیے بچوں کی فطرت کا رازداں بن کر تخلیقات کو موضوع و اسلوب سے ہم آہنگ کرنا پڑتا ہے، نثر کے مقابلے میں شاعری اور بھی زیادہ دشوار ہے، یہ وہی شاعر کرسکتا ہے جو بچوں کے ساتھ بچہ بن کر سہلِ ممتنع کی شاعری کرے، اِس کے پاس علم کا جو خزانہ ہے، اُسے بچوں کے ذہن میں یوں منتقل کردے کہ بچہ کھیل سمجھ کر اُسے قبول کرلے، یہ اُس کے ذہن پر بوجھ نہ بنے، ہر بچہ کی ذہنی سطح اُس کے ماحول و تربیت کی بنا پر مختلف ہوتی ہے۔ برطانیہ کا بچہ صبح ہوتے ہی اخبار سے کھیلتا ہے لہٰذا اُس ملک کی ڈپلومیسی مشہور ہے، جاپان کا بچہ صبح آنکھ کھولتے ہی کھلونے کی طرف دوڑتا ہے اِس لیے کہ وہاں کے کھلونے اور مشینیں شہرت رکھتی ہیں۔ ہماری تیسری دنیا کے بچے روٹی کے لیے ہاتھ پیر مارتے ہیں کیوں کہ یہاں بھوک و افلاس حاوی ہے۔ بچوں کا معیاری ادب ایسے سبھی قسم کے بچوں کی صلاحیتوں کو اُبھارنے میں معین و مددگار بن سکتا ہے۔ معیاری ادب کا مطلب اُس کی ادق زبان یا بھاری بھرکم الفاظ کا استعمال نہیں بلکہ اِس سے مراد وہ ادب ہے، جسے بچہ دل و دماغ میں جذب کرلے اور اُس کے ذہنی اُفق کو وسیع کرنے میں مددگار بنے۔ اِس عمر میں عقل تو کچی ہوتی ہے لیکن تخیل تیز ہوتا ہے۔

یاد رکھیے! ہمارے معاشرے کی تعمیر و تشکیل کا دارومدار اِس پر بھی ہے کہ ہمارے بچے کس طرح کے خواب دیکھتے ہیں، کن باتوں کے بارے میں سوچتے اور کیا بننا چاہتے ہیں، نامعلوم کا تجسس اور معلومات کی مسرت مل کر ہی اُن ذہنوں کی تشکیل کرتی ہے، جن سے خواب دیکھنے والے فنکار اور اُن خوابوں کو عملی شکل میں ڈھالنے والے دانشور و سائنس داں پیدا ہوتے ہیں، اِس لیے غور و فکر کا پہلو یہ ہے کہ ہم بچوں کو کیا بنا رہے ہیں۔ یہ سوال معاشرے، اسکول اور گھر تینوں سے وابستہ ہے۔

آج کی دنیا سائنس و ٹیکنالوجی کے فروغ سے کافی سمٹ گئی ہے، انسان ایک دوسرے سے قریب آگئے ہیں، لیکن ایجادات و اختراعات کا یہ مطلب نہیں کہ انسان اُن بنیادوں کو نظرانداز کردے جو ایجادات و تخلیقات کی وجہ ہیں۔ ہر ایجاد کے پیچھے جو شے کارفرما ہوتی ہے، وہ انسانی فکر و ذہن کی روشنی ہے اور اِس انسانی ذہن کو تابناک بنانے کا ذریعہ علم ہے، جو کتابوں تک محدود نہیں لیکن علم کی ترقی میں کتابوں کا حصّہ سب سے زیادہ ہے۔ کتابیں صرف اوراق کا مجموعہ نہیں بلکہ علم کے وسیع سمندر سے اُس کی مثال دی جاسکتی ہے، آنے والی نسلیں اِس سمندر سے پیاس بجھاکر اپنی منزل تک پہنچتی ہیں جو دنیا میں اُن کی سرخروئی کا باعث بنتی ہے، لیکن ہمارے معاشرے میں کتابوں سے دلچسپی تشویشناک حد تک کم ہورہی ہے، اِس کے لیے صرف نئی نسل کو ذمے دار قرار دینا زیادتی ہوگی کیوں کہ اِس کمی و کوتاہی کے لیے گھر، اسکول اور معاشرے مساوی طور پر ذمے دار ہیں، اِس سے بھی بڑا سانحہ یہ ہے کہ اِس رجحان کی سنگینی کو نہ تو سمجھنے کی کوشش ہوئی، نہ بدلنے کے لیے قدم بڑھائے گئے، کتب بینی کے کم ہوتے اِس رویے کے لیے عام طور پر ٹیکنالوجی کی ترقی کو ذمے دار قرار دیا جاتا ہے، لیکن انٹرنیٹ ہو یا کمپیوٹر ہرگز یہ تقاضا نہیں کرتے کہ اُن کے لیے چوبیس گھنٹے فارغ کردیے جائیں۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ آج گھر کے بڑوں نے بچوں کی تربیت بالخصوص اُن کی سرگرمیوں پر نظر رکھنا چھوڑ دیا ہے، کم ہی گھرانے ایسے ہوں گے جہاں بچے بڑوں کی نظر میں رہ کر غیر صحت مند سرگرمیوں سے دور رہتے ہوں، اُن کی اخلاقی قدریں پروان نہ چڑھنے کی ایک وجہ ہمارے یہاں کے مشترکہ خاندانی نظام کا کمزور ہونا بھی ہے۔ اِس نظام کا بڑا فائدہ یہ تھا کہ ماں باپ ہی نہیں، دوسرے رشتے دار بھی دادا، دادی، نانا، نانی، چچا، پھوپھی سب بچوں کی سرگرمیوں، عادات و اطوار سے واقف ہوتے تھے اور اُن کی غلطیوں پر ٹوک دینا اپنی ذمے داری سمجھتے تھے۔ اِس نظام میں رہتے ہوئے بچے اپنی ثقافت و تہذیب سے بھی آگاہ ہوتے تھے، پڑھنے لکھنے کے لیے وقت فارغ کرتے تھے، اُن کی تعلیم کا آغاز عموماً گھر کے بڑوں سے ہوتا تھا، جس میں رات کو کہانیاں سنانا شامل تھا، اِن کہانیوں میں حیرت، سبق، تاریخی واقعات، بہادری کے قصے اور نصیحتیں ہوتی تھیں اور یہ بچوں کی ذہنی تربیت میں معاون بنتی تھیں، چھوٹی عمر میں کہانیاں سننے کی یہ روش نوجوان ذہنوں کو کہانیاں پڑھنے اور لکھنے پر اُبھارتی تھی۔ محنت و شوق سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاتے تھے، اِس نظام میں معلومات کے تبادلے کے لیے مواقع بھی زیادہ تھے، والدین نہیں تو خاندان کے دوسرے بزرگوں سے گفتگو کرکے نوجوان اپنی ادھوری معلومات مکمل کرلیتے تھے۔

آج کے عہد کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ بچوں کی مادری زبان میں تعلیم ہو، اِس کی فکر سرپرستوں کو نہیں، اِس لیے بچوں کو نہ اُردو کی کہانیوں سے دلچسپی ہے، نہ نظموں سے، پچیس تیس سال قبل تک جن کہانیوں، کتابوں اور رسالوں کے بچّے عاشق تھے، آج کے زمانے کے بچے اُن کے نام بھی نہیں جانتے۔ مہاراشٹر، آندھرا، کرناٹک، بہار ریاستوں میں بچے اُردو کی تعلیم حاصل کررہے ہیں، ... (بقیہ صفحہ 7 پر)

اردو دُنیا

'غیر جانبدارانہ صحافت وقت کی ضرورت'

نئی دہلی (3 مئی)۔ ورکنگ جرنلسٹ کلب کے دسویں یومِ تاسیس کے موقعے پر انڈیا اسلامک کلچرل سنٹر میں 'سماجی اتحاد کو یقینی بنانے میں میڈیا کا کردار' کے موضوع پر ایک اہم اور فکر انگیز کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر ممتاز صحافتی، سماجی اور سیاسی شخصیات نے شرکت کی اور میڈیا کی ذمے داریوں پر تفصیلی گفتگو کی۔ سمینار کا آغاز سیّد اسرار احمد کی تلاوتِ کلام پاک اور قاسم شمسی کی نعت رسولِ مقبولؐ سے ہوا۔ تقریب کے دوران سینئر کرائم رپورٹر امیر احمد راجا کوان کی طویل اور نمایاں صحافتی خدمات کے اعتراف میں لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس اعزاز میں اکیاون ہزار روپے نقد اور سپاس نامہ بھی شامل تھا۔ مہمانِ خصوصی جسٹس اقبال انصاری نے اپنے خطاب میں کہا کہ صحافت جمہوریت کا چوتھا ستون ہے اور ایک سچے صحافی کی پہچان اس کی غیر جانبداری اور حق گوئی میں مضمر ہے۔ انھوں نے زور دیا کہ صحافی کو ہمیشہ طاقتور کی بجائے کمزور اور مظلوم کے ساتھ کھڑا ہونا چاہیے کیوں کہ یہی ایک صحت مند اور متوازن جمہوریت کی بنیاد ہے۔ انڈیا اسلامک کلچرل سنٹر کے سابق صدر سراج الدین قریشی نے کہا کہ ماضی میں اخبارات میں شائع ہونے والی خبریں نہایت مستند اور اہمیت کی حامل ہوتی تھیں، لیکن موجودہ دور میں سوشل میڈیا کی تیز رفتاری نے نہ صرف روایتی صحافت کی اہمیت کو متاثر کیا ہے بلکہ صحافتی معیار میں بھی گراوٹ آئی ہے۔ ڈاکٹر سردار خاں، فیروز غازی، حاجی ظہور اٹیچی والے، ڈاکٹر ایم جے خاں، کمپنی سکریٹری نثار احمد خاں، فیروز بخت، سعید خاں، محمد تقی اور ڈاکٹر صغیر اختر سمیت دیگر مقررین نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا اور میڈیا کے مثبت کردار کو سماجی ہم آہنگی کے لیے ناگزیر قرار دیا۔ سمینار کے اختتام پر اس عزم کا اظہار کیا گیا کہ ذمے دار، غیر جانبدار اور معیاری صحافت ہی معاشرے میں اتحاد، بھائی چارے اور جمہوری اقدار کے فروغ کو یقینی بنا سکتی ہے۔ اہم شرکا میں شیخ علیم الدین اسعدی، نسیم احمد، حاجی اسعد میاں، فیروز مظفر، فرید مرزا، ناصر خاں، ڈاکٹر فہیم بیگ، شفیع دہلوی، ایم نفیس، ایڈوکیٹ رئیس احمد، ذاکر حسین وغیرہ شامل تھے۔ (انقلاب۔دہلی)

اردو اکادمی دہلی، وقف بورڈ اور اقلیتی کمیشن کی تشکیلِ نو میں تاخیر پر اظہارِ افسوس

نئی دہلی (29 اپریل)۔ دارالحکومت دہلی میں اہم اقلیتی ادارے اردو اکادمی دہلی، دہلی وقف بورڈ اور دہلی اقلیتی کمیشن کافی عرصے سے عملی طور پر غیر فعال ہیں۔ عام آدمی پارٹی کی حکومت کے دوران بھی ان اداروں کی مکمل تشکیلِ نو نہیں ہوسکی تھی اور اب بی جے پی کی حکومت قائم ہونے کے بعد بھی اس سمت میں کوئی ٹھوس پیش رفت نظر نہیں آ رہی ہے، جس پر سماجی و تعلیمی حلقوں میں تشویش پائی جا رہی ہے۔ سرکردہ سماجی کارکن حاجی ظہور اٹیچی والے نے کہا کہ ان اداروں کی غیر فعالیت سے نہ صرف اردو زبان و ادب کی ترویج متاثر ہو رہی ہے بلکہ وقف جائدادوں کے تحفظ اور اقلیتی طبقات کے حقوق سے متعلق معاملات بھی تعطل کا شکار ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ انتہائی افسوسناک بات ہے کہ دہلی جیسے بڑے شہر میں اقلیتوں سے متعلق اہم ادارے برسوں سے غیر فعال پڑے ہیں۔ حکومتیں بدلتی رہیں لیکن کسی نے سنجیدگی سے ان اداروں کی بحالی کی طرف توجہ نہیں دی۔ اردو اکادمی دہلی کا غیر فعال ہونا زبان و تہذیب کے لیے نقصان دہ ہے جب کہ وقف بورڈ کی کمزوری سے املاک کے تحفظ پر سوال اٹھ رہے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہم حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ فوری طور پر ان اداروں کی تشکیلِ نو کا عمل شروع کیا جائے اور اہل و باصلاحیت افراد کو ذمے داریاں دی جائیں تاکہ عوام کا اعتماد بحال ہو سکے۔ اگر یہی صورتِ حال رہی تو اقلیتی طبقات میں مایوسی مزید بڑھے گی، جو کسی بھی جمہوری نظام کے لیے مناسب نہیں ہے۔ (انقلاب۔دہلی)

بیس جلدوں پر مشتمل ڈاکٹر عطا خورشید کے مرتبہ 'مجموعۂ نثرِ سرسیّد' کا اجرا

علی گڑھ (پریس ریلیز)۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری کے کلچرل ہال میں 25 اپریل 2026 کو ایک علمی و ادبی تقریب منعقد ہوئی جس میں ڈاکٹر عطا خورشید کی مرتبہ بیس جلدوں پر سرسیّد کی تمام تحریروں پر مشتمل کتاب 'مجموعۂ نثرِ سرسیّد' کا اجرا عمل میں آیا۔ یہ مجموعہ سرسیّد احمد خاں کی تمام چھوٹی بڑی تحریروں، مضامین، مقالات اور دیگر نثری سرمایے کو یکجا کرنے کی ایک منفرد اور بے مثال کاوش ہے، جسے علمی حلقوں میں اس صدی کا سب سے بڑا کارنامہ قرار دیا جا رہا ہے۔

تقریب کی صدارت پدم شری حکیم سیّد ظل الرحمٰن نے کی۔ کتاب پر اپنے تاثرات پیش کرنے والوں میں پروفیسر آزرمیدخت صفوی، پروفیسر صغیر افراہیم، پروفیسر نشاط فاطمہ، پروفیسر محبّ الحق تھے۔ اساتذہ اور طلبہ کی ایک بڑی تعداد اس جلسے میں موجود تھی۔ تقریب کا آغاز تلاوتِ کلام پاک سے ہوا۔ ڈاکٹر عطا خورشید نے استقبالیہ خطبہ پیش کیا جس میں انھوں نے اس طویل اور صبر آزما تحقیقی سفر کی روداد بیان کی۔

پدم شری حکیم سیّد ظل الرحمٰن نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ 'مجموعۂ نثرِ سرسیّد' محض ایک کتاب نہیں بلکہ ایک عہد کی بازیافت ہے۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر عطا خورشید نے جس عرق ریزی، تحقیق اور دیانت داری کے ساتھ سرسیّد کی تمام تحریروں کو جمع کیا ہے، وہ نہ صرف علی گڑھ تحریک بلکہ برِّصغیر کی فکری تاریخ کے لیے ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے مطابق یہ مجموعہ آنے والی نسلوں کے لیے ایک مستند ماخذ ثابت ہوگا اور سرسیّد شناسی کے نئے در کھولے گا۔

پروفیسر آزرمیدخت صفوی نے سرسیّد کے فکری تنوع پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اس مجموعے میں شامل تحریریں سرسیّد کے ہمہ جہت ذہن کی عکاسی کرتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ سرسیّد کے افکار کو اس جامعیت کے ساتھ یکجا کرنا ایک ایسا کارنامہ ہے جس کی مثال ماضی میں نہیں ملتی۔ اس مجموعے کے ذریعے نہ صرف سرسیّد کی فکری وسعت کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ ان کے عہد کے سماجی، تعلیمی اور مذہبی مسائل بھی پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔

پروفیسر صغیر افراہیم نے اسے اردو تحقیق کے لیے ایک نئے باب کا آغاز قرار دیا۔ پروفیسر محبّ الحق نے اپنے تاثرات میں کہا کہ ڈاکٹر عطا خورشید نے جس محنت اور سلیقے سے اس مجموعے کو موضوعاتی بنیادوں پر مرتب کیا ہے، وہ جدید تحقیقی اصولوں کی بہترین مثال ہے۔

آخر میں پروفیسر نشاط فاطمہ نے اس عظیم علمی خدمت کو لائبریری روایت کا تسلسل بتایا۔ انھوں نے خصوصی طور پر عطا خورشید کے اِس علمی کام کو علیگ برادری کی طرف سے فرضِ کفایہ قرار دیا۔

بیس جلدوں پر مشتمل یہ مجموعہ تقریباً دس ہزار صفحات پر محیط ہے اور اسے موضوعاتی ترتیب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، جس کے تحت ہر جلد ایک مخصوص موضوع پر مشتمل ہے۔ اس میں سرسیّد کی وہ تحریریں بھی شامل ہیں جو نایاب، متفرق یا متنازع سمجھی جاتی رہی ہیں، خصوصاً ان کی تفسیرِ قرآن، جسے طویل عرصے تک دوبارہ شائع کرنے سے گریز کیا جاتا رہا۔ ڈاکٹر عطا خورشید نے اس حساس پہلو کو بھی علمی جرأت اور تحقیق کے ساتھ شامل کر کے اِس اہم خلا کو پُر کیا ہے۔

تقریب میں یہ بات بھی خاص طور پر اُجاگر کی گئی کہ ڈاکٹر عطا خورشید اس سے قبل بھی سرسیّد پر قابل ذکر کام کر چکے ہیں۔ انھوں نے 2022 میں 'کلیاتِ خطباتِ سرسیّد' کے عنوان سے تین جلدوں پر مشتمل ۲۰۲ خطبات کو جمع کر کے شائع کیا۔ جب کہ 2023 میں سرسیّد کے اردو و انگریزی خطوط کو چھ جلدوں میں مرتب کر کے 'کلیاتِ مکتوباتِ سرسیّد' کے عنوان سے شائع کیا۔ اس طرح موجودہ مجموعہ ان کے مسلسل تحقیقی سفر کی ایک بلند ترین کڑی ہے، جس کے ذریعے انھوں نے سرسیّد کی تقریباً تمام تحریریں یکجا کر دی ہیں۔

مقررین نے اس بات پر اتفاق کیا کہ 'مجموعۂ نثرِ سرسیّد' نہ صرف سرسیّد احمد خاں کے افکار کو نئے زاویوں سے سمجھنے میں مدد دے گا بلکہ علی گڑھ تحریک کی تفہیم کے لیے بھی ایک بنیادی حوالہ بن جائے گا۔

آخر میں عطا خورشید نے شکریہ کی رسم ادا کی۔ ڈاکٹر عاطف حنیف نے نظامت کے فرائض بخوبی انجام دیے۔ حاضرین نے اس عظیم علمی کارنامے پر ڈاکٹر عطا خورشید کو دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کی۔

قومی اردو کونسل میں اردو ادب پینل کی میٹنگ

نئی دہلی (پریس ریلیز، 20 اپریل)۔ قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی کے صدر دفتر میں 20 اپریل 2026 کو اردو ادب پینل کی میٹنگ کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر قدوس جاوید (سابق صدر، شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی) نے کی۔ میٹنگ کے آغاز میں کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد شمس اقبال نے تمام مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے اردو ادب پینل کے تحت کونسل کی کارکردگی پر روشنی ڈالی۔ صدارتی خطاب میں پروفیسر قدوس جاوید نے کہا کہ اردو کا ادبی سرمایہ کافی ثروت مند اور اہم ہے، البتہ ضرورت اس بات کی ہے کہ دیگر زبانوں میں لکھی گئی اہم علمی و ادبی کتابوں کے اردو تراجم شائع کیے جائیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے کئی تجاویز بھی پیش کیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہندوستان کی علاقائی زبانوں کے تعلق سے بھی اردو میں کام کرنے کی ضرورت ہے اور کونسل یہ کام بحسن و خوبی انجام دے سکتی ہے۔ میٹنگ میں شریک ہونے والے دیگر اراکین پروفیسر صغیر افراہیم (علی گڑھ)، پروفیسر نسیم الدین فریس (حیدرآباد)، محترم جانکی پرساد شرما (دہلی)، پروفیسر شبنم حمید (شعبۂ اردو، الٰہ آباد یونیورسٹی، پریاگ راج)، پروفیسر احمد محفوظ (شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی) پروفیسر آفتاب احمد آفاقی (شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی)، پروفیسر مشتاق عالم قادری (شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی)، ڈاکٹر نعیم انیس (شعبۂ اردو، کلکتہ گرلز کالج، کولکاتہ) اور ڈاکٹر درانی شبانہ (شعبۂ اردو، یشونت مہا ودیالیہ، ناندیڑ، مہاراشٹر) نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے مفید مشورے دیے۔ اس میٹنگ میں ممبران نے پینل کے تحت جاری اور مکمل شدہ مختلف پروجیکٹس کی صورتِ حال کا جائزہ لیا اور گذشتہ دنوں موصول ہونے والے نئے پرپوزلس کے تعلق سے بھی فیصلے لیے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر کلیم اللہ (ریسرچ آفیسر، فاصلاتی تعلیم، این سی پی یو ایل) ڈاکٹر مسرت (ریسرچ آفیسر، اکیڈمک، این سی پی یو ایل)، جناب نایاب حسن (ریسرچ اسسٹنٹ، اکیڈمک، این سی پی یو ایل)، ڈاکٹر فیضان الحق (ریسرچ اسسٹنٹ، ایڈیٹوریل، این سی پی یو ایل) اور جناب محمد افروز (پروجیکٹ اسسٹنٹ، این سی پی یو ایل) وغیرہ بھی موجود تھے۔

انجمن ترقی اردو (ہند) جھارکھنڈ کی آرٹی آئی پر محکمۂ تعلیم رانچی متحرک

رانچی (پریس ریلیز ،28اپریل)۔اردو زبان کی موجودہ صورتِ حال اوراس سے متعلق سرکاری اسامیوں کے مستند اعداد وشمار کے حصول کے لیے انجمن ترقی اردو (ہند) جھارکھنڈ کی جانب سے ایک مؤثر اور منظّم پہل کا آغاز کیا گیا ہے۔اس سلسلے میں انجمن جھارکھنڈ کے جنرل سکریٹری جناب ایم زیڈ خان نے آرٹی آئی کے تحت متعلقہ محکموں سے تفصیلات طلب کر کے ایک قابلِ تقلید مثال قائم کی ہے۔قابلِ ذکر ہے کہ محکمہ تعلیم رانچی کے DSE نے نہایت سرعت کے ساتھ صرف دو دنوں کے اندر اس درخواست پر عمل درآمد کرتے ہوئے متعلقہ اداروں کو رپورٹ پیش کرنے کی ہدایت جاری کی جو سرکاری نظام میں شفافیت اور جوابدہی کے مثبت رجحان کی عکاسی کرتا ہے۔اسی تسلسل میں مورخہ 25 اپریل 2026 کو منعقدہ آن لائن توسیعی میٹنگ میں ریاست جھارکھنڈ کے تمام اضلاع کے جنرل سکریٹریز کو یہ ہدایت دی گئی کہ وہ اپنے اپنے اضلاع میں اردو سے متعلق اسامیوں، خالی اسامیوں اور تقرریوں کی مکمل تفصیلات حاصل کریں۔اس اقدام کا مقصد نہ صرف حقائق کو منظرِ عام پر لانا ہے بلکہ اردو کے فروغ اوراس کے حقوق کے تحفظ کے لیے ایک منظّم اور مؤثر تحریک کو فروغ دینا بھی ہے۔

انجمن کے جنرل سکریٹری جناب ایم زیڈ خان نے اس موقعے پر کہا کہ اگر سنجیدگی ،خلوص اور قانونی طریقِ کار کے ساتھ کوشش کی جائے تو سرکاری نظام کو متحرک کیا جا سکتا ہے۔اردو کے حقوق کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ ہم منظّم انداز میں اعداد وشمار جمع کریں اور متعلقہ اداروں کو جوابدہ بنائیں۔انجمن کے نشر واشاعت سکریٹری ڈاکٹر اشرف علی نے اس اقدام کو بصیرت افروز اور قابلِ تحسین قرار دیتے ہوئے کہا کہ یہ پوری کارروائی اس بات کا ثبوت ہے کہ مسلسل جدوجہد اور تحریکی جذبے کے ذریعے ہم اردو کے مسائل کو اجاگر کر سکتے ہیں۔

انجمن ترقی اردو (ہند) جھارکھنڈ نے تمام اضلاع کے ذمے داران، سماجی کارکنان اور اردو کے چاہنے والوں سے اس مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی اپیل کی۔مزید برآں یہ بھی مطلع کیا جاتا ہے کہ ان اہم مسائل کے حوالے سے انجمن کا ایک وفد بہت جلد وزیرِ اعلا جھارکھنڈ جناب ہیمنت سورین سے ملاقات کر کے اردو سے متعلق درپیش مسائل اور مطالبات کو پیش کرے گا۔

معصوم مرادآبادی کی کتاب کا اجرا
دانشوروں کا خراجِ عقیدت

نئی دہلی (13اپریل)۔سینئر صحافی وادیب معصوم مرادآبادی کی مرتّب کردہ کتاب 'ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی: قائدِ ملّت، مسیحائے قوم' کی رسمِ اجرا کی ایک پُروقار تقریب کانسٹی ٹیوشن کلب آف انڈیا کے اسپیکر ہال میں منعقد ہوئی۔ یہ تقریب انڈین مسلمس فار سول رائٹس، نئی دہلی کے اشتراک سے منعقد کی گئی۔ تقریب کی صدارت سابق رکنِ پارلیمنٹ محمد ادیب نے کی جب کہ دہلی کے سابق لیفٹیننٹ گورنر نجیب جنگ مہمانِ خصوصی تھے۔کتاب کا اجرا آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کے سابق صدر ڈاکٹر ظفرالاسلام خاں اور دیگر معزز مہمانوں کے ہاتھوں عمل میں آیا۔مہمانانِ اعزازی میں سابق چیف انفارمیشن کمشنر وجاہت حبیب اللہ، پٹنہ ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس جسٹس اقبال احمد انصاری، رکنِ پارلیمنٹ مولانا محبّ اللہ ندوی، پدم شری پروفیسر اختر الواسع اور ڈاکٹر ایس. فاروق شامل تھے۔تقریب کا آغاز مولانا محبّ اللہ ندوی کی تلاوتِ کلام پاک سے ہوا۔نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے معصوم مرادآبادی نے کہا کہ شخصیت نگاری ان کا محبوب مشغلہ ہے اور وہ سیکڑوں شخصیات کے خاکے لکھ چکے ہیں۔انھوں نے بتایا کہ قومی یکجہتی کونسل میں ڈاکٹر فریدی کی ایک تاریخی تقریر کا اُردو ترجمہ بھی شاملِ کتاب ہے۔انھوں نے مزید کہا کہ کتاب میں ڈاکٹر فریدی کی فکر، مشن، جدوجہد اور خدمات کو جامع انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ڈاکٹر ظفرالاسلام خاں نے کہا کہ میرے بچپن میں یہ تصور عام تھا کہ عبدالجلیل فریدی ہندستان میں ٹی بی کے سب سے بڑے معالج تھے اور انھوں نے اپنی پوری زندگی ملک وملّت کے لیے وقف کر دی۔ انھوں نے بارہ دری میں مجلسِ مشاورت کے پہلے اجتماع کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس موقعے پر ڈاکٹر فریدی نمایاں شخصیت تھے۔

پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ انھیں ڈاکٹر فریدی سے براہِ راست سیکھنے کا موقع ملا۔انھوں نے بتایا کہ ڈاکٹر فریدی نے سکھایا کہ مسلمانوں کے مسائل کو قومی مسائل کے طور پر پیش کیا جانا چاہیے۔نجیب جنگ نے اپنے خطاب میں کہا کہ آزادی کے بعد مسلم قیادت کی مجبوری یہ تھی کہ ان کی سیاست حکومت کے ساتھ وابستہ تھی جس کے باعث وہ کھل کر اپنی بات نہیں رکھ پاتے تھے۔ اگرچہ انھوں نے فسادات کے بعد متاثرہ علاقوں کا دورہ کیا اور مختلف کمیشنوں میں خدمات انجام دیں، لیکن وہ مسلمانوں کے مسائل کو موثر انداز میں پیش نہ کر سکے۔انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر فریدی نے اسی خلا کو محسوس کرتے ہوئے ایک ایسی تنظیم کی ضرورت پر زور دیا جو بلاخوف حکومت سے مکالمہ کر سکے۔

صدارتی تقریر میں سابق ممبر پارلیمنٹ محمد ادیب نے کہا کہ آزاد ہندستان میں مسلمانوں کو آج تک ڈاکٹر فریدی جیسا قائد نہیں ملا۔ افسوس کہ ہم نے اپنے اتنے بڑے محسن کو فراموش کر دیا۔اس کام کے لیے انھوں نے معصوم مرادآبادی کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے یہ کتاب مرتّب کر کے بڑا کارنامہ انجام دیا۔ دیگر مقررین میں جسٹس اقبال انصاری، وجاہت حبیب اللہ اور ڈاکٹر ایس فاروق نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔تقریب میں م. افضل، قربان علی، سلیم قدوائی، خالد صدیقی، شبیہ احمد، عمران قدوائی، ڈاکٹر ظہیر احمد، پروفیسر محسن عثمانی، پروفیسر خالد محمود اور ڈاکٹر سیّد احمد خاں سمیت متعدد اہم شخصیات نے شرکت کی۔ (انقلاب۔دہلی)

حسامیہ گرلز اسکول میں عالمی یومِ کتب پر 'تحریکِ مطالعہ' پروگرام کا شاندار انعقاد

ناگپور (23اپریل)۔شانتی نگر میں واقع حسامیہ گرلز ہائی اسکول میں 'عالمی یومِ کتاب' کے موقعے پر ایک تقریب 'تحریکِ مطالعہ' کے تحت منعقد کی گئی۔ اسکول کی ہیڈ مسٹریس محترمہ تسنیم فدوی صاحبہ نے صدارت فرمائی، مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر محمد اظہر حیات مدعو تھے جب کہ مہمانِ اعزازی کی حیثیت سے جناب شیخ عبدالوحید صاحب اور انور پٹیل صاحب شریک تقریب تھے۔تقریب کا آغاز تلاوتِ قرآن مجید اور نعت پاک سے ہوا۔اس کے بعد محترمہ تسنیم فدوی صاحبہ نے مہمانوں کا استقبال فرمایا۔

اس موقعے پر ڈاکٹر محمد اظہر حیات نے طالبات سے خطاب کرتے ہوئے تعلیم کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی اور مطالعۂ کتب پر زور دیا۔موصوف نے کئی مثالوں سے اپنی بات کو مدلل بنایا۔ڈاکٹر اظہر حیات نے بچوں کو اچھے اخلاق وعادات کا خوگر بننے پر بھی زور دیا۔آخر میں جناب انور پٹیل صاحب نے بھی بچوں سے خطاب فرمایا۔ وقت زیادہ ہونے کی وجہ محترم وحید صاحب خطاب نہ کر سکے تاہم موصوف نے نیک خواہشات سے نوازا۔ نظامت کے فرائض محترمہ گل افشاں زہرا نے بہ حسن وخوبی انجام دیے۔رسمِ شکریہ محترمہ عشریہ ترنم نے ادا کی۔ شدید گرمی کے باوجود اسکول کی طالبات نہایت خوش دلی سے کثیر تعداد میں نظم وضبط کے ساتھ شریک رہیں۔

رفتید ولے نہ از دلِ ما

پروفیسر احمد سجّاد

رانچی۔ اردو ادب کے ممتاز نقاد، معروف ادیب اور رانچی یونیورسٹی کے سابق ڈین فیکلٹی آف آرٹس وسابق صدر شعبۂ اردو پروفیسر احمد سجاد کا 26 اپریل 2026 کی شب تقریباً ساڑھے دس بجے انتقال ہوگیا جس کی خبر پھیلتے ہی علمی، ادبی اور سماجی حلقوں میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ نمازِ جنازہ بریاتو پہاڑی میدان (مسجد الحرا کے قریب) میں ادا کی گئی جس میں شہر کی ممتاز علمی، ادبی، مذہبی اور سماجی شخصیات کے ساتھ ساتھ بڑی تعداد میں طلبہ، ریسرچ اسکالرز اور عوام نے شرکت کی۔ جنازے میں موجود اہم شخصیات میں صدر شعبۂ اردو رانچی یونیورسٹی ڈاکٹر محمد رضوان علی، مولانا تہذیب الحسن رضوی، پروفیسر منظور علی بیگ، ڈاکٹر حسن رضا، ڈاکٹر خالد سجاد، انجینئر طارق سجاد، ڈاکٹر اعجاز احمد، ڈاکٹر آغا ظفر حسنین، ڈاکٹر علی منظور بیگ، ڈاکٹر محمد غالب نشتر، مولانا اصغر مصباحی، ڈاکٹر شکیل احمد، ڈاکٹر محفوظ عالم، شہرِ قاضی مفتی قمر عالم، مولانا آفتاب عالم ندوی، مولانا مجیب الرحمٰن ندوی، قاری عبداللہ، ڈاکٹر وکیل احمد رضوی، راشد جمال، دانش ایاز، علی احمد شمیم، حافظ صدام حسینی سمیت دیگر معززین شامل تھے۔ پروفیسر احمد سجاد کی علمی وادبی خدمات نہ صرف ملک بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ ان کی کتابیں 'تعمیری ادبی تحریک: افکار و مسائل'، 'تنقید و تنقیح'، 'تنقید و تحریک'، 'اکیسویں صدی کا چیلنج اور علمی تعلیمی ایجنڈا'، 'کیا برِّ صغیر کی اردو آبادی عذابِ مسلسل کا شکار ہے'، 'جدید نظریات کی کھلی ناکامی اور اسلام کا روشن مستقبل'، 'ہندستان کا جدید تعلیمی انقلاب اور مسلم اقلیت'، 'جنوبی ہند کا ایک علمی وادبی سفر' اور مجلّہ 'ابلاغ' (مدیر ڈاکٹر احمد سجاد) وغیرہ اردو دنیا میں مقبول ہیں اور خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں جن کے سبب اردو تنقید، تحقیق اور تدریس کے میدان میں ان کی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ان کی وفات سے اردو ادب کا ایک روشن باب ختم ہوگیا۔ادبی حلقوں، اساتذہ اور طلبہ نے ان کے انتقال کو ایک ناقابلِ تلافی نقصان قرار دیا اور مرحوم کے درجات کی بلندی کے لیے دعا کی۔

امیراللہ عنبر خلیقی

ناگپور۔اردو کے بزرگ شاعر امیراللہ عنبر خلیقی 96 برس کی عمر میں 27 اپریل 2026 کو انتقال فرما گئے۔تدفین مرکزی مسلم قبرستان مومن پورہ، ناگپور میں ہوئی۔ مرحوم نہایت ملنسار اور منکسر المزاج تھے۔ وہ فکرِ شعر کو محض وقت گزاری کا مشغلہ نہیں سمجھتے تھے۔ان کی شاعری ملمع سازی اور بناوٹ سے کوسوں دور تھی۔ وہ ادب کے حوالے سے زندگی کی ترجمانی وتنقید کرتے تھے، اس لیے ان کی شاعری سے قوم وملّت کو فکر و عمل کی تحریک ملتی تھی۔ ان کے چار مجموعہ ہائے کلام: 'احساس کا سفر'، 'تلقینِ مسلسل'، 'بازگشت' اور 'ارتقائے سخن' شائع ہو چکے ہیں۔مرحوم ہندی زبان میں بھی شعر کہتے تھے۔وہ پیشے سے سول انجینئر اور آرکیٹیکٹ تھے۔ وہ مساجد اور مدارس کی تعمیرات خلوص اور خدمت کی بنیاد پر کرتے تھے۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحومین کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبرِ جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

اسٹینڈرڈ انگلش اُردو ڈکشنری
مولوی عبدالحق
قیمت: 500 روپے

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب	:	گرمِ دمِ جستجو (خاکے)
خاکہ نگار	:	ڈاکٹر شکیلؔ احمد
اشاعت	:	2025
ضخامت	:	224 صفحات
قیمت	:	350 روپے
ناشر	:	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
تبصرہ نگار	:	سعید اختر اعظمی

E-mail: sakhtar0075@gmail.com

’نرم دمِ گفتگو‘ اور گرم دمِ جستجو‘ کے لیے جتنے مشاہدے درکار ہیں میری جھولی میں تو اس کا عشرِ عَشیر بھی نہیں، مگر جتنا بھی ہے میرے نزدیک اس میں سچائی ہے۔ یہ میری خوش فہمی بھی ہوسکتی ہے، مگر ہر خوش فہمی فریب نہیں دیتی‘۔ ڈاکٹر شکیل احمد کا یہ عجز وانکسار حقیقت کا اعترافیہ ہے۔ انھوں نے جن شخصیات پر خامہ فرسائی کی ہے ان میں بزرگ کرم فرما، احباب اور ہم عصر بھی شامل ہیں۔ وہ ’ادب برائے ادب‘ کے بجائے ’ادب برائے زندگی‘ کے قائل ہیں، اسی لیے مرحومین کے شانہ بہ شانہ باحیات افراد کی رفاقت کو بھی موضوعِ گفتگو بنایا گیا ہے۔ وہ تقریباً ایک دہائی سے خاکہ نگاری کے میدان میں سرگرم ہیں جس کا عملی نمونہ ’سمٹتا سائبان‘ (2015) اور ’بادبان چھاؤں‘ کی صورت میں سامنے آچکا ہے۔

’گرمِ دمِ جستجو‘ ڈاکٹر شکیل احمد کے خاکوں کا تیسرا مجموعہ ہے جس میں دو درجن سے زیادہ باحیات و مرحومین شامل ہیں۔ ابتدا ’جن کے ابرو پہ شکن آکے پلٹ جاتی تھی‘ کے اعزاز سے سرفراز ’مولانا اسیر ادروی‘ سے ہوتی ہے۔ ان سے پہلی ملاقات تقریباً آٹھ برس کی عمر میں ہوئی تھی۔ ان کی خودداری، اصول پرستی اور صاف گوئی کا ایک واقعہ یہاں نقل کیا گیا ہے جس کے مطابق 1987 میں سر اقبال پبلک اسکول کے لیے ان سے زمین خریدی گئی تھی۔ اسکولی کمروں کی تعمیر کے بعد نئی بلڈنگ کے افتتاح پہ انھیں مدعو کیا گیا تو انھوں نے یہ کہہ کر معذرت کرلی کہ ’جو زمین میں نے نکال دی وہ اب میری نہیں رہ گئی۔ اب تک اپنی فروخت کردہ زمین پر میں نے کہیں قدم نہیں رکھا، اس لیے میری حاضری ممکن نہیں‘۔ یہ اسیر کب ہوئے خودنوشت داستان ناتمام میں کہیں نہیں ملتا۔ انھوں نے نصف صدی ملک وقوم کی خدمت اور سیاسی سرگرمیوں میں گزار دی۔ زندگی کے ہر موڑ پر نئے خواب کو حقیقت کا روپ دینے کی ٹھانی اور 16 برس تدریس، تصنیف و تالیف میں لگا دیے۔ جامعہ اسلامیہ بنارس کو الوداع کہہ کر جب وہ ادری تشریف لائے تو اشاعت پذیر کتب کا وزن اتنا تھا کہ وہ اس کا بار نہ اُٹھا سکتے تھے۔ دوسرا خاکہ ’منشی ممتاز احمد مرحوم‘ کا ہے جو دارالعلوم مئو کے مایۂ ناز استادِ فارسی تھے۔ ان کا اختصاص یہ تھا کہ مدرسہ انتظامیہ اور رفقائے کار کی کبھی شکایت نہیں کی، جو کچھ بھی ہوتا ہنس کر خود پر جھیل لیتے۔

تیسرا خاکہ ’مولانا ضیاء الدین اصلاحی‘ کا ہے جو استادِ محترم کا درجہ رکھتے تھے۔ وہ ایک سڑک حادثے میں انتقال کر گئے۔ چوتھا خاکہ ’ڈاکٹر حیدر علی خاں‘ کا ہے جنھوں نے اپنی خودنوشت کا نام ’سپاہی کا بیٹا قلم کا سپاہی‘ رکھا تھا۔ پانچواں خاکہ ’پروفیسر احمد سجاد‘ کا ہے جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔ وہ ایک عہد ساز ادیب و محقق تھے۔ ’مومن کانفرنس کی تاریخ‘ ان کی دستاویزی کتاب ہے۔ چھٹا خاکہ ’مولانا عزیز الحسن صدیقی‘ کا ہے جو غازی پور ضلع رابطہ کمیٹی کے سکریٹری تھے۔ ساتواں خاکہ ’ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی‘ کا ہے جو تدریس و تصنیف میں یکساں دلچسپی لیتے تھے۔ ’تواریخ ریلاس‘ اور پی ایچ. ڈی کا مقالہ ’نذیر احمد: شخصیت اور کارنامے‘ اپنے موضوع کے لحاظ سے کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ آٹھواں خاکہ ’پروفیسر عتیق احمد صدیقی‘ کا ہے جو رابطہ کمیٹی علی گڑھ کے سکریٹری تھے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اردو بھی رہے ہیں اور کئی اہم کتابوں کے مصنف ہیں۔ نواں خاکہ ’پروفیسر عبدالحق‘ کا ہے جو ماہرِ اقبالیات کے بلند منصب پر فائز ہیں اور دہلی یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر رہے ہیں، اب دہلی یونیورسٹی میں پروفیسر ایمریٹس ہیں۔ دسواں خاکہ ’پروفیسر فضل امام رضوی‘ کا ہے جن کی دل نشیں گفتگو سامعین پر سحر طاری کردیتی تھی۔ تحقیق و تنقید، تبصرے و تراجم، خطابت اور مشاعروں کے اسٹیج سے ان کا دیرینہ تعلق رہا۔ گیارہواں خاکہ ’شبیر احمد حکیم مالیگاؤں‘ کا ہے جن کی تصنیف ’حکایت کی حکایت‘ برسوں کی تلاش و تحقیق کا دستاویزی حوالہ ہے۔ بارہواں خاکہ ’پروفیسر ظفر احمد صدیقی‘ کا ہے جو کئی درجن کتب کے مصنف ہیں۔ تیرہواں خاکہ ’عبدالحئی پیام انصاری‘ کا ہے جنھوں نے اردو کی روٹی نہیں کھائی مگر اس کی ترویج و بقا میں پیش پیش رہے۔ چودہواں خاکہ ’ڈاکٹر شباب الدین‘ کا ہے جو صبر و شکر کا بہترین نمونہ ہیں۔ پندرہواں خاکہ ’ڈاکٹر انعام الحق گورکھ پوری‘ کا ہے جو 1979 میں شعبۂ اردو گورکھ پور یونیورسٹی میں سینئر ریسرچ فیلو تھے۔ سولہواں خاکہ ’حاجی ریاض احمد چودھری‘ کا ہے جن سے نصف صدی دیرینہ تعلقات رہے۔ سترہواں خاکہ ’مولانا ارشاد خلیل معروفی‘ کا ہے جن کے اندر مخاطب کو متاثر کرنے کے متعدد خصائص موجود تھے۔ وہ وسیع المشرب انسان تھے اور سب سے خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ اٹھارہواں خاکہ ’ڈاکٹر غلام حسین‘ کا ہے جن سے چار دہائی پہ محیط مراسم رہے۔ انیسواں خاکہ ہم سبق ’عمران اللہ صدیقی‘ کا ہے جنھوں نے آزاد ماحول میں رہ کر تعلیم حاصل کی پھر بھی کسی قسم کے اثرات بداُن میں داخل نہیں ہوئے۔ بیسواں خاکہ ’ڈاکٹر آفتاب احمد اصلاحی‘ کا ہے جو پیشے سے مسیحا تھے اور دل کے زخموں کو ساری عمر ڈھوتے رہے۔ اکیسواں خاکہ ’مولانا قمر الزماں مبارک پوری‘ کا ہے جنھوں نے ’سخن وران اعظم گڑھ‘ ترتیب دے کر اپنا نام تاریخ میں زندہ جاوید کرلیا۔ بائیسواں خاکہ ’ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی‘ کی یادوں کے حوالے سے ہے۔ ان کے تذکرے میں حسن اتفاق وسوٴے اتفاق یوں در آیا ہے:

> ’مجھے وہ گھڑی شدت سے یاد آتی ہے جب ایم نسیم اعظمی اور ایم بقا اعظمی کی چند برس کے وقفے سے شادیاں ہوئیں۔ خاکسار نے ان کی برات میں شرکت کی۔ وقت نے وہ دن دکھائے کہ جن احباب کی برات میں شرکت کی تھی ان کی میت کو کاندھا بھی دینا پڑا۔ پہلے بقا اعظمی گئے، پھر ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی بھی چلے گئے‘۔ (ص188)

تیئیسواں خاکہ ڈاکٹر آفاق احمد فاخری کا ہے جو تحت اللفظ اور ترنم بھری شاعری سے سب کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں۔ چوبیسواں خاکہ ’مشتاق کریمی جلگاؤں‘ کا ہے جنھوں نے ’میٹھا کریلا چینل‘ کے ذریعے ناظرین پہ سحر پھونک دیا۔ پچیسواں اور آخری خاکہ ’مولانا انصار احمد معروفی‘ کا ہے جن کے زیرِ ادارت ماہنامہ پیغام کے خصوصی شمارے قاری کے لیے حیران کن ہیں۔ اس کا ’سائیکل نمبر‘ اپنی مثال آپ ہے۔ ان خاکوں کے اختتام پر مصنف کی مطبوعہ کتابوں (اردو افسانوں میں سماجی مسائل کی عکاسی، مٹھی بھر خطوط، سفر کی خوشبو، بادل چھاؤں، نشاط قلم) پہ تبصرے شامل ہیں۔ سب سے منفرد کتاب کے مندرجات ہیں۔ اس فہرست میں دو درجن سے زیادہ شخصیات کی چند سطری تلخیص پیش کی گئی ہے جو انفرادیت کی خوب صورت مثال ہے۔ امید ہے ڈاکٹر شکیل احمد کی خاکوں پر مبنی کتاب ’گرمِ دمِ جستجو‘ خاطر خواہ پذیرائی حاصل کرے گی۔ ✤✤✤

انجمن ترقی اردو (ہند) کی نئی کتاب

نگارشاتِ سحر

مضامینِ پروفیسر سحر انصاری

تدوین وحواشی: **محمد صابر**

- پروفیسر سحر انصاری برِّ صغیرِ ہندو پاک کی ان نابغۂ روزگار شخصیتوں میں سے ہیں جن کے علم کی روشنی نے تقریباً نصف صدی کے عہد کو روشن و منور رکھا ہے اور ان کے علم وفن کا نہ صرف ایک زمانہ معترف ہے بلکہ اس سے فیضیاب ہونے والوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہی ہو رہا ہے، لیکن ابھی بھی علم وفن کے متوالوں کا ایک حلقہ ایسا ہے جہاں اس مینارۂ ادب کی روشنی ابھی تک نہیں پہنچ سکی ہے۔
- انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی ایسی ہی شخصیتوں کی نادر تحریروں کو اردو ادب کے عام قاری تک اپنے نفیس اور پُرکشش انداز میں پہنچانے کے لیے ہمیشہ سرگرم رہی ہے۔ اس سلسلے کو نہایت منظّم انداز میں آگے بڑھاتے ہوئے پروفیسر سحر انصاری کی نادرِ روزگار ادبی نگارشات کو شائع کرنے کی جانب عملی قدم اٹھایا گیا ہے۔ اس کتاب کو محمد صابر نے تدوین وحواشی کے ساتھ مرتّب کر کے قارئینِ کرام کے لیے مزید جامع اور کارآمد بنا دیا ہے۔
- بلاشبہ یہ کتاب پروفیسر سحر انصاری کی نادر، بیش بہا اور انتہائی عالمانہ تحریروں کا ایسا مجموعہ ہے جو شائقینِ ادب کے لیے ایک گراں مایہ تحفہ ثابت ہوگی۔

ضخامت: 208 صفحات —— قیمت: 250 روپے

سلیم کوثر کا فن: خالی ہاتھوں میں ارض وسما کے تناظر میں

(بقیہ صفحہ 8 سے آگے)

کھلے دریچوں میں یادیں سجی ہوئی ہیں سلیم
بچھڑ کے اس سے یہ صورت قرار جاں کی ہے

جانے کیا بات تھی ہم کتابوں کے صفحے اُلٹتے رہے، جس بڑھتا رہا
پھر اچانک کسی نام پر بے ارادہ ہی لب رکھ دیے اور ہوا چل پڑی

سلیم کوثر کی کتاب 'خالی ہاتھوں میں ارض وسما' کا پہلا ایڈیشن 1981 میں شائع ہوا، ان پینتالیس برسوں میں خالی ہاتھوں میں ارض و سما کی اہمیت اور افادیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی بلکہ اس کتاب کی اہمیت اور افادیت میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوا ہے، ہر اصیل شاعر کی طرح سلیم کوثر نے بھی نہ صرف دوسروں کی زمینوں میں اچھے شعر کہے بلکہ بیش تر نئی زمینیں بھی تراشیں، انہی نئی زمینوں میں (اور ہوا چل پڑی) ردیف والی غزل بھی شامل ہے۔سلیم دوسروں کو چونکانے یا اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے کوئی مضحکہ خیز تجربہ نہیں کرتے اور نہ نئی ردیف یا نیا قافیہ محض نئی زمین نکالنے کے لیے استعمال کرتے ہیں بلکہ سلیم کوثر شاعری اپنے مافی الضمیر کو بیان کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ان کے ہاں تمثیل اور تمثال، خیال اور کرافٹ، جذبہ اور مشاہدہ، احساس اور تجربے کی بھٹی میں جل کر کندن بنتے ہیں تب کہیں جا کر ایک شعر وجود میں آتا ہے، ایک ایسا شعر جسے پڑھ یا سن کر قاری پر ایک سرشاری کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔سلیم کوثر کے اشعار پڑھنے اور سننے والوں پر بہت گہرا اثر طاری کرتے ہیں اور ان کے اشعار کا تاثر وقتی یا عارضی نہیں ہوتا:

بارشیں تھم گئیں، دکھ برسنے لگے آئنے ڈھل گئے اور ہوا چل پڑی
نیند میں ڈگمگاتے ہوئے سائے خوابوں میں چلنے لگے اور ہوا چل پڑی

میں خود اپنی آگ ہی میں جل بجھا تو یہ کھلا
شرط جلنے کی نہیں تھی کیمیا ہونے کی تھی

بدن میں رچی ہوئی مسافتوں کی تھکن، ساعتوں پہ بازگشتی صدا، دیار دل میں خواہشوں کا وہ شور کہ جس سے وقت کی صدا سنائی نہ دے۔وصل کی آرزو، ہجر کا دکھ، دیواروں سے جھانکتی مٹیالی مٹی، فضاؤں میں گھلا موسم کا زہر، تنہائی میں بولتی تصویروں کا روگ، دھیان کے پنجرے سے ٹکراتا یاد کا پاگل پنچھی، چراغ اور اندھیرے کی جنگ، وصل کی خوشبوئیں، بے کراں ساعتیں، مہرباں آیتیں، سواد ہجر میں سناٹے کی پکار، نیند میں ڈگمگاتے ہوئے سایوں کا خوابوں میں چلنا، مانوس ہنگاموں کی تنہائی، جاگتے راستوں پر سرابوں کے ویراں افق اور ایسی بہت سی دیگر منفرد سمعی، بصری اور حرکی تمثالیں سلیم کوثر کی شاعری کو دیگر عصری شاعری سے مختلف بناتی اور منفرد مقام عطا کرتی ہیں۔ہوا، چراغ، دھوپ، سایہ، روشنی، سورج، ماں، شام، گھر، خاک اور آگ جیسی علامتوں کو سلیم کوثر نے نفسیاتی، معاشرتی، معاشی اور اقتصادی وعصری تناظرات میں نہایت باریک بینی سے شعری واردات کا حصہ بنایا ہے، اسی طرح محبت کرنے والوں کی نفسیات کو بھی سلیم کوثر نے مکمل شعری جمالیات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے شعر میں سمو دیا ہے، چند اشعار دیکھیے:

جو دھوپ چھٹتا پھرا دوپہر کی گلیوں سے
وہ شخص اپنے ہی سائے سے ڈرنے والا تھا

ہجر کی مسافت میں خواب تک نہیں آتے
بارشوں کے موسم میں دھوپ کم نکلتی ہے

میں تو آوارہ سہی پر شام کے ڈھلنے تلک
میرا سایہ آن ملتا ہے تری دیوار سے

اس طرح دن کے اجالے سے ڈرے لوگ سلیم
شام ہوتے ہی چراغوں کو بجھانے لگ جائیں

سبھی نے میرے چراغوں کی لو چرالی ہے
اب انتظار سحر میں کوئی نہیں رہتا

منڈیر پر چراغ رکھ دیے ہیں خود جلائے گا
وہ آنے والا شخص جانے کس طرف سے آئے گا

جو اپنے خون سے اپنی گواہی خاک پر لکھ دے
ہم ایسے آدمی کو آسمانوں پر اٹھا لیں گے

مری خاک میں ہیں نمو کی ساری اذیتیں
کف کوزہ گر میں ہے زائچہ مرے بخت کا

میں بکھرنے کو ہوں اب مجھ کو ہوالے جائے گی
اور کتنی دور تک تیری صدا لے جائے گی

تیری نظروں سے روشنی لے کر
لوگ دشت قیاس سے گزرے

سلیم روشنی کو روشنی کہے
یہاں کسی کو یہ مجال بھی نہیں

مرے وجود میں سچائی میری ماں کی ہے
وگرنہ شعر عبادت تو قرض جاں کی ہے

گلیوں میں بھٹک رہی ہیں راتیں
سورج کا کہیں پتا نہیں ہے

جب خاک ہی ہونا ہے سر محفلِ دنیا
کیا کیجے گھر کے در و دیوار اٹھا کر

آگ کا ہالا ہے میرے پاؤں میں
چل رہا ہوں میں عزا داروں کے بیچ

جدید شہری زندگی کے شب و روز، مشینی عہد کی بے مصرف مصروفیات، بے چہرہ گلیاں، ہنگامہ خیز زندگی میں فرد کی ذاتی تنہائی اور نگاہوں کو خیرہ کرتی روشنیوں کے درمیان میں تاریکیوں کے بڑھتے ہوئے بوجھ کو سلیم کوثر نے اپنی شاعری میں منفرد انداز میں منعکس کیا ہے:

تاریکیوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے سلیم
کب سے جھکا ہوا ہے کوئی شمع دان پر

سلیم کوثر اس تمام تر صورتِ حال سے نالاں تو ہیں مگر مایوس وہ ہرگز نہیں ہیں:

بے گھری کا گلہ ان بدلتی رتوں میں مجھے بھی نہیں
آسماں پیرہن اور ہواؤں کے پھیلے ہوئے بام و در

خیموں میں چراغ بجھ رہے ہیں
یہ وقت فرار کا نہیں ہے

ایک سچے اور حقیقی شاعر کو ان تیسرے درجے سے نیچے گرے ہوئے بونے شاعروں سے ڈرنے یا خوف کھانے کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ سچی شاعری وہ خوشبو ہے جس کا راستہ روکا نہیں جا سکتا، سلیم کوثر کا خیال ہے:

میں سچا مرے لفظ بھی سچے مجھ کو ڈر بھی کیا ہے سلیم
اوپر ایک خدا رہتا ہے، نیچے ماں کا سایا ہے

ہر سچا شاعر نہ صرف یہ کہ روح عصر کا حقیقی ترجمان ہوا کرتا ہے بلکہ اس پر مستزاد یہ کہ فرد بینی اور فرد شناسی کے فن سے آشنا بھی ہوتا ہے، عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم اور عشق الٰہی کی سچی لگن جس طرح سلیم کوثر کی شاعری میں کارفرما دکھائی دیتی ہے، بہت کم شعرا کے حصے میں آئی ہے۔سلیم کوثر روایتی نعت نگاری نہیں کرتے بلکہ وہ اپنے اشعار میں سیرت نگاری کا فریضہ سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ اپنے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے اپنے عہد اور اپنے لوگوں کا درد استغاثہ کی صورت میں پیش کرتے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے عہد کے لوگوں کو اور خود کو بھی تسلی اور امید سے ہم کنار کرتے ہیں، اسے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی ذات باصفا پر بے حد یقین ہے، وہ اس کا مکمل ادراک رکھتے ہیں اور ان کا ایمان ہے کہ خواہ دنیا میں کوئی ایک سہارا باقی نہ ہو تب بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا دامن اس کے ہاتھ سے کبھی نہیں چھوٹے گا اور آپ اسے کبھی مایوس ہونے نہیں دیں گے، سلیم کوثر کی نعت کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ایک آہٹ کی تحویل میں ہیں زمیں آسماں کی حدیں
ایک آواز دیتی ہے پہرا بہت اور گہرا بہت

میری بینائی سے اور مرے ذہن سے محو ہوتا نہیں
میں نے روئے محمدؐ کو سوچا بہت اور چاہا بہت

بے یقیں راستوں پر سفر کرنے والے مسافر سنو
بے سہاروں کا ہے اک سہارا بہت، کملی والا بہت

میرے ہاتھوں سے اور میرے ہونٹوں سے خوشبوئیں جاتی نہیں
میں نے اسم محمدؐ کو لکھا بہت اور چوما بہت

اللہ تعالیٰ سلیم کوثر کو صحت عطا فرمائے۔سلیم کوثر صرف ایک فرد نہیں بلکہ ایک عہد کا نام ہے۔سلیم کوثر نے غزل کو جو لہجہ اور آہنگ عطا کیا ہے، وہ انھی کا حصہ ہے اور اس کی بہر حال ستائش کی جانی چاہیے۔

E-mail: hassan.jameel3860@gmail.co
Mob. No. +92 3335943860

ادبِ اطفال: ضرورت و اہمیت

(بقیہ صفحہ 3 سے آگے)

لہٰذا اُنھیں ہر ماہ بچوں کے رسائل کا انتظار رہتا ہے، وہ اُردو میں کہانیاں اور نظمیں شوق سے پڑھتے ہیں، اس لیے موجودہ عہد کا بنیادی کام سرپرستوں اور بچوں میں اُردو پڑھنے، پڑھانے کا مزاج بنانا اور اس کو رواج دینا ہے، اِس کے بعد بچوں کے ادب پر توجہ نتیجہ خیز ثابت ہوگی، یہ ادب بھی بچوں کا ہم مزاج ہو، غیر فطری و جذباتی نہ ہو، ایسے موضوعات پر قلم اُٹھایا جائے جو عہدِ حاضر کی زندگی سے وابستہ ہوں، علم و معلومات میں اضافے کا باعث بنیں، بچوں کو عزم و ہمت کے ساتھ انسانیت کا سبق پڑھائے، بچوں کی نفسیات و کیفیات کو پیش نظر رکھ کر جو ادب لکھا جائے گا، وہی بامقصد اور ثمر آور ہوگا۔

ایڈیٹر روزنامہ 'ندیم' بھوپال
Mob. 09425673760
E-mail : arifazizBPL@rediffmail.com

اردو ہندی ڈکشنری
انجمن ترقی اردو (ہند)
قیمت: 300 روپے

سلیم کوثر کا فن

’خالی ہاتھوں میں ارض وسما‘ کے تناظر میں

حسن جمیل

ایک قبیلہ چھوڑ دیا اور اک دنیا آباد رکھی
میں نے پہلا شعر لکھا اور شجرے کی بنیاد رکھی

یہ منفرد شعر سلیم کوثر کا ہے۔ سلیم کوثر نے اپنی شاعری کے اوائل ہی میں اپنی انفرادیت کا اعلان کر دیا تھا اور اس کا یہ اعلان بہت سوں کی طرح محض زبانی کلامی نہیں تھا بلکہ اس نے یہ اعلان اپنی منفرد تمثال کاری، استعارے اور علامت کے جداگانہ طرزِ تعمیر، مضامین کے بیان میں استدلال اور اپنے منفرد ترین طرزِ احساس کی بنیاد پر کیا: ’خالی ہاتھوں میں ارض وسما‘ ان کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے، اس کے علاوہ ان کی کتابیں ’خواب آتے ہوئے سنائی دیے‘، ’یہ چراغ ہے تو جلا رہے‘، ’ذرا موسم بدلنے دو‘، ’محبت کی شجر ہے‘، ’دنیا بھری آرزو سے کم ہے‘، ’کلیات جنھیں راستے میں خبر ہوئی‘ اور نعتیہ مجموعہ ’میں نے اسم محمد کو لکھا بہت‘ شائع ہو کر قبولِ عام کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ سلیم کوثر خاص طور پر اپنی غزل جس کا مطلع ہے:

میں خیال ہوں کسی اور کا مجھے سوچتا کوئی اور ہے
سرِ آئینہ میرا عکس ہے، پسِ آئینہ کوئی اور ہے

کے لیے بڑی شہرت رکھتے ہیں۔

احمد فراز کا خوب صورت شعر ہے:

فراز عشق کی دنیا تو خوب صورت تھی
یہ کس نے فتنۂ ہجر و وصال رکھا ہے

سلیم کوثر کی محبت اتنی سچی ہے کہ اس کے ہاں محبوب کی غیر موجودگی میں بھی ہجر و فراق کے لمحات کا در آنا محال ہے، وہ کہتا ہے:

تو نے کہا تھا عشق میں تنہا کیسے جی سکتا ہے کوئی
تجھ کو بھول گئے اور تیری بات ہمیشہ یاد رکھی

اور یہ بے مثال شعر:

یہ لوگ عشق میں سچے نہیں ہیں ورنہ ہجر
نہ ابتدا نہ کہیں انتہا میں آتا ہے

عشق کا بنیادی محرک جذبہ ہے، عشق کے موضوع پر غزلیہ شاعری میں بہت لکھا گیا مگر بہت سے لکھنے والوں کے ساتھ یہ حادثہ بھی پیش آیا کہ ان کے ہاں جذبہ رسمی صورت اختیار کر گیا اور یوں عشق کے موضوع پر کی گئی ان کی شاعری میں کرافٹ کی خوبیوں کے باوجود وہ نیا پن جگہ نہیں پا سکا جس سے تازگی نمو پذیر ہوتی ہے، تاہم منیر نیازی، احمد فراز، پروین شاکر، عدیم ہاشمی اور سلیم کوثر اس وبا کا شکار نہیں ہوئے یعنی ان شعرا نے جذبے کو رسمی نوعیت اختیار کرنے نہیں دی اور یہی وجہ ہے کہ منیر نیازی، احمد فراز، پروین شاکر، عدیم ہاشمی اور سلیم کوثر کی عشقیہ شاعری کو پڑھ کر انفرادیت اور تازگی کا احساس ہوتا ہے۔

عدیم ہاشمی کا ایک شعر دیکھیے جہاں محبت جیسے پامال موضوع پر بھی نہ صرف یہ کہ جدید تر طرزِ اظہار نمایاں نظر آتا ہے بلکہ جدت کے باوجود تغزل میں کسی طرح کی کمی واقع نہیں ہوتی:

وہ کہ خوشبو کی طرح پھیلا تھا میرے چار سو
میں اسے محسوس کر سکتا تھا چھو سکتا نہ تھا

اور اب عشق کے لازوال موضوع پر سلیم کوثر کا ایک شعر دیکھیے جہاں روایت کے ساتھ گہری وابستگی ہوتے ہوئے بھی ایک منفرد تازگی کا احساس نمایاں ہو گیا ہے:

عالم ذات میں مجذوب بنا دیتا ہے
عشق انسان کو پاگل نہیں ہونے دیتا

وہ کہتا ہے کہ اداس پہاڑوں سے سردیوں کی برف کے ملنے سے پیدا ہونے والا ربط دھوپ کی ایک کرن سے ٹوٹ بھی سکتا ہے، اور اسے معلوم ہے کہ بچھڑتی اور ملتی ساعتوں کے درمیان ایک پل ہے جسے بچانے کے لیے سب کچھ داؤ پر لگا دیا گیا ہے۔

یہاں سچ سننا کوئی نہیں چاہتا مگر سچ بولنے کا جھوٹا دعوا ہر کوئی کرتا ہے۔ جھوٹا اس لیے کہ اب اکثر لوگ صرف دوسرے کے حصے کا آدھا سچ بولتے ہیں جب کہ اپنے حصے کا آدھا سچ کمال ہوشیاری سے چھپا لیتے ہیں یہ جانتے ہوئے بھی کہ آدھا سچ پورے جھوٹ سے بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ جانے یہ لوگ اس آدھے سچ سے کس کس کو دھوکا دے رہے ہیں، اسی لیے سلیم کوثر کہتا ہے کہ سچ بولنے کے لیے آئینے کے سامنے رہنا بہت ضروری ہے، آئینہ علامت ہے ضمیر کے زندہ وجود کی، آئینہ علامت ہے اس احساس کی جس میں اپنی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر خود سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ انسان دوسروں سے تو بآسانی جھوٹ بول سکتا ہے مگر خود سے جھوٹ بولنا اس کے لیے مشکل ہوتا ہے۔ دوسروں کو بآسانی دھوکا دے سکتا ہے مگر خود اپنے آپ کو دھوکا دینا اتنا آسان بھی نہیں ہوتا۔ سلیم کوثر کہتا ہے:

تمھیں کیسے بتائیں جھوٹ کیا ہے اور سچ کیا ہے
نہ تم نے آئنہ دیکھا نہ آئینہ دکھایا ہے

آئینہ سچ کا استعارہ ہے آئینہ ہی وہ علامت ہے جو انسان کو اس کا اصل روپ دکھاتی ہے آئینہ میں نہ صرف انسان اپنی ظاہری صورت دیکھ سکتا ہے بلکہ غور سے دیکھنے پر باطن کے اسرار بھی ظہور پذیر ہو سکتے ہیں۔ سلیم کوثر نے اپنی شاعری میں آئینہ کا استعارہ بار بار استعمال کیا اور ہر بار اسے نئے معانی سے روشناس کرا کر پیش کیا۔ چند اشعار پیشِ خدمت ہیں:

آئینہ رکھا ہے کرداروں کے بیچ
دشمنوں کے اور مرے یاروں کے بیچ

اگر کوئی بھی آئینہ چراغ آسا نہیں ہے
تو کیا ہم راہ گیروں کے لیے رستہ نہیں ہے

ہم آئنہ صفت ہوئے تو یہ کھلا
ہمارے اپنے خدو خال بھی نہیں

اب آئینہ حیرت سے اک اک کا منہ تکتا ہے سلیم
پہلے لوگ تو آئینے میں چہرہ دیکھنے والے تھے

نگاہ پر سب آئنے بحال کر دیے
بس ایک فرصت نظر نہ دے سکا ہمیں

جو عکس ٹوٹ گیا اس کا کیا بنے گا سلیم
شکستگی اگر آئینے کی رفو کی جائے

اور یہ خوب صورت شعر:

ہر آنکھ پہ کھلتی نہیں آئینے کی حیرت
ہر آئنہ رکھتا نہیں حیرت کو چھپا کر

محبت کے موضوع کو سلیم کوثر نے اپنی ندرت خیال اور اپنے جدید تر طرزِ احساس سے نہ صرف نئے پن سے روشناس کرایا ہے بلکہ اپنے تجربے کی انفرادیت سے اس کی وسعت میں بھی ایک حد تک نمایاں اضافہ کیا ہے:

عذاب در بدری ہے کہ ہجرتِ مہ و سال
کہ خواب اور کسی کے ہیں دھیان تیرا ہے

میں تجھے ڈھونڈنے یادوں کی کھلی سڑکوں پر
خشک پتوں کی طرح روز بکھر جاتا ہوں

چشمِ گریزاں ایک نظر اس جانب
ہم تیرے بیماروں میں زندہ ہیں

اک دوسرے کے کتنے مزاج آشنا تھے ہم
اور پھر بھی اختلاف کی راہیں نکل پڑیں

ابھی تو ملنے کی ساعت سلیم آئی نہیں ہے
ابھی سے دل میں کیسے کیسے ڈر آنے لگے ہیں

…(بقیہ صفحہ 7 پر)

ادارے کا مضمون نگاروں کی آرا سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے (ادارہ)

مدیر : اطہر فاروقی
Editor : Ather Farouqui
شریکِ مدیر: محمد عارف خاں
Joint Editor : Mohd. Arif Khan
معاون مدیران: منور حسن کمال، سالم فاروق ندوی
Assisistant Editors : Munawwar Hasan Kamal, Salim Farooq Nadwi
پرنٹر پبلشر: عبدالباری
Printer Publisher : Abdul Bari
مطبوعہ : جاوید پریس، 2096، روڈگراں، لال کنواں، دہلی-٦
مالک : انجمن ترقی اردو (ہند)
اردو گھر، 212، راؤز ایونیو، نئی دہلی-110002
Proprietor:
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar, 212-Rouse Avenue,
New Delhi-110002
قیمت : فی شمارہ: پانچ روپے، سالانہ: 200 روپے
بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر
Subscription: (Per Issue): Rs. 5/-, Annual: 200/-
(Foreign Countries: US $ 8)
E-mail: hamarizaban.weekly@gmail.com
http://www.atuh.org,
Phones: 0091-11-23237722